منزل بھی تیری ذات ہے اور ہمسفر بھی تُو

مولا مرا چراغ تُو شمس و قمر بھی تُو
طُولِ شبِ فراق میں نُورِ سحر بھی تُو
نیلم زمرد پارس و لعل و گہر بھی تُو
حدِ نظر بھی تُو ہی تُو مدِ نظر بھی تُو
مولا مرے ادھر بھی تُو میرے اُدھر بھی تُو
منزل بھی تیری ذات ہے اور ہمسفر بھی تُو

جلوے ترے ہزار ہیں کوہ و دمن کے بیچ
تتلی بہار پھول کی صورت چمن کے بیچ
سنبل گلاب لالہ و سرو و سمن کے بیچ
ہر ہر گُلِ بہار کی ہر انجمن کے بیچ
کرتا ہے ڈال ڈال کو اک باثمر بھی تُو
منزل بھی تیری ذات ہے اور ہمسفر بھی تُو

تُو وہ ہے جو کہ خاک سے خوشبو نکال دے
پھولوں کو رنگ روپ دے اور بے مثال دے
اک کُن سے کہکشاؤں کو رستے پہ ڈال دے

اک دو نہیں ہزار جو سورج اُچھال دے
وہ بے مثال و باکمال و با ہنر ہے تو
منزل بھی تیری ذات ہے اور ہمسفر بھی تُو

مولا میں بےقرار ہوں اور چشمِ تر ہوں میں
اندھا سا اک فقیر سرِ رہگزر ہوں میں
سنتا ہوں تیری چاپ جدھر بس اُدھر ہوں میں
بخشش کی بھیک مانگتا پھرتا اِدھر ہوں میں
میرے خیال و خواب سے اک باخبر بھی تو
منزل بھی تیری ذات ہے اور ہمسفر بھی تُو

مولا وہ بھیک دے جو کرے درگزر مجھے
جانے دے بے حساب ہی اور خاص کر مجھے
اپنے کرم سے کر وہ عطا چشمِ تر مجھے
دھو کر مرے گناہ جو کرے معتبر مجھے
دشت طلب میں ایک مرا راہبر بھی تُو
منزل بھی تیری ذات ہے ور ہم سفر بھی تو۔۔۔۔۔۔

حمد

اُس سے مانگ کے دیکھ کبھی اے مُورکھ سے اِنسان
جو کہ جل تھل کر سکتا ہے پیاس کے ریگستان
جس خورشید کو دیکھ کے پگھلیں برف کے بلتستان
جس کا وصل مٹا دیتا ہے ہجر کے راجھستان
ساری دنیا چھوڑ چھاڑ کے اُس سے جا کے مل
رو رو اپنا حال سنا اور رکھ قدموں میں دل
پاؤں اُسکے پڑ کے کہنا اے نوروں کے نور
جس نے کاٹے کشت ہزاروں،میں ہوں وہ مزدور
گرتے پڑتے آیا ہوں میں گھائل چُور و چُور
کر دے گھپ اندھیرے مجھ سے میلوں صدیوں دور
بخش دے مجھ کو دیکھ نہ میرا نامہء اعمال
میرے ہاتھ نہ پلے کچھ بھی ایسا ہوں کنگال
دُکھ کے ببر شیر ہیں پیچھے بن جا میری ڈھال
پھر نہ دنیا مُڑ کے دیکھوں ایک نظر وہ ڈال
تیرے ہاتھ میں بخشش کے ہیں اربوں بحرِ ہند
رحمت کا اک چھڑک وہ قطرہ جی اُٹھے یہ جِند

نعت

اہل دنیا کو نجانے اور کیا اچھا لگا
اہل دل کو بس محمد مصطفیٰ اچھا لگا

روشنی پہ جان دینے پھر پتنگے آ گئے
شب گزیدہ قوم کو روشن دیا اچھا لگا

درد کے صحرا میں بارش وصل کی جل تھل ہوئی
ہجر کے ماروں کو موسم وہ بڑا اچھا لگا

جس نے چومے ہاتھ اُسکے خود بھی خوشبو ہو گیا
اہل دل کو عشق کا یہ معجزہ اچھا لگا

پیار کرنا جرم ہے تو سن زمانے غور سے
وہ ہمیں تھوڑا نہیں بے انتہاء اچھا لگا

اُسکی خاطر زخم جو آئے وہ سارے پھول تھے
اُسکے کوچے تک ہمیں ہر کربلا اچھا لگا

پیار کیسے ہو گیا یہ واقعہ ہے مختصر
ہم دکھی تھے اور ہمیں دکھ آشنا اچھا لگا

عشق بھی کیا چیز ہے اب کیا بتائیں دوستو
اُس کے گھر جو لے گیا وہ راستہ اچھا لگا

کیا عجب روز قیامت وہ مبارک یہ کہیں
میرے اس شاعر نے اُس دن جو کہا اچھا لگا

نعت

تیرا ﷺ نام ہے ابھی زیرِ لب
یہ فضاء ابھی سے گلاب ہے
یہ بھی جانتی ہے مری طرح
تیرا نام لینا ثواب ہے

تیری بات کیسے نہ میں کروں
کہ یہی تو اصل حیات ہے
تیرا لفظ لفظ ہے اس طرح
کہ ہزار باتوں کی بات ہے

یہ گماں نہیں ہے یقین ہے
یہی دن تو وجہ قرار ہیں
جو گزر گئے تیری یاد میں
وہ عبادتوں میں شمار ہیں

میرے پیشوا میرے رہنما
تجھے چاہنے سے خدا ملے
مگر آجکل میرے شہر میں

بڑی سخت اس کی سزا ملے

تجھے چاہنا ہے خطا اگر
مجھے جرم اپنا قبول ہے
کہ سنا ہے کوچہ یار تک
لگے خار جو وہی پھول ہے

\-

نعتیہ کلام

نام ایسا کہ دل جگمگانے لگے
کام ایسے کہ روح گنگنانے لگے
حسن ایسا کہ دیئے جلانے لگے
بات ایسی کہ خوشبو سی آنے لگے

اور چہرہ کہ جیسے ہو ماہ تمام
,,علیک الصلواۃ علیک السلام,,

وہ لطافت تھی جیسے کہ آذان ہو
وہ حلاوت تھی جیسے کہ قرآن ہو
وہ طراوت تھی جیسے گلستان ہو
وہ سخاوت تھی جیسے کہ طوفان ہو
وہ محبت کہ عاشق ہوئے خاص و عام
علیک الصلواۃ علیک السلام

اُنکے آتے ہی موسم بدلنے لگے
پھول خوشبو کی صورت مچلنے لگے

دل کے پتھر دعا سے پگھلنے لگے
جاں بلب لوگ پھر سے سنبھلنے لگے
مسکرا کے فرشتوں نے بھیجے سلام
علیک الصلوٰۃ علیک السلام

اُن کو دیکھا تو اُن پر فدا ہو گئے
بت فروشوں سے وہ با خدا ہو گئے
اُنکے در کے گدا بادشاہ ہو گئے
لوگ مٹی کے وہ کیمیاء ہو گئے
بن گئے سیدی ایک حبشی غلام
علیک الصلوٰۃ علیک السلام

بے سہاروں کا وہ آسرا بن گئے
بیقراروں کی وہ اک صدا بن گئے
درد دیکھا جہاں پہ دوا بن گئے
بیچ منجھدھار کے نا خدا بن گئے

عشق ایسا کیا، کہہ اُٹھے وہ تمام
علیک الصلوٰۃ علیک السلام

نظم

کسے ہجرتوں کا ملال ہے

کسے ہجرتوں کا ملال ہے
کسے فرقتوں کا خیال ہے
جو گزر گئی تیری یاد میں
وہی شام شامِ وصال ہے

میرا خواب تھا کسی روز تو
میری منتظر یوں بہار ہو
جو اُٹھے نگاہ جھکی ہوئی
میرے روبرو رخ یار ہو

وہی یار کہ وہ جدھر چلے
وہاں روشنی کا نزول ہو
جو لکھے وہ حرف مجیب ہو
جو کرے دعا وہ قبول ہو

وہ شگفتہ گل کہ جسے چھوئے
وہی شاخ سبز گلاب ہو
جسے سوچنے کی جزا ملے
جسے دیکھنا بھی ثواب ہو

اُسے شاعری سے ہو گر شغف
میرا لہجہ مثل فراز ہو
اُسے زاہدوں سے ہو پیار تو
میری ہر قدم پہ نماز ہو

کبھی یوں بھی ہو وہ مجھے کہے
تری سب دعائیں قبول ہیں
ترے رت جگے ہیں سنے گئے
ترے خار آج سے پھول ہیں

کبھی یوں بھی ہو سر بزم وہ
مجھے یہ کہے کہ غزل سنا
میں غزل غزل میں اُسے کہوں
مرا کچھ نہیں ہے ترے سوا

کوئی دم درود وہ کر کے جو

میرے قلب و جاں کو نکھار دے

وہ دعا بھی دے مجھے پیار سے

مرے دو جہاں جو سنوار دے

نظم محاسبہ۔ مبارک صدیقی

ہجر کی کالی رات میں اُٹھ کے دل کے دیپ جلا
آنکھ کے مر جانے سے پہلے آنسو چار بہا
نفس کے کالے جادوگر سے جلدی جان چھڑا
اُس کی یاد میں ایسے رو کہ ہستی جائے ہِل
وقت نکال کسی دن تھوڑا اپنے آپ سے مل
تنہائی میں بیٹھ کسی دن خود سے مانگ حساب
کتنے تُو نے خار چُنے ہیں کتنے پھول گلاب
دو آنکھوں میں پال لئے ہیں تُو نے دو سو خواب
تُو نے خود کو جان لیا ہے شائد سب سے تیز
وقت کی دیمک چاٹ گئی ہے رُستم اور چنگیز
بات سمجھنے والی ہے اس دل کو یہ سمجھا
جیسے تیسے ہو سکتا ہے جا کے یار منا
آنکھ کے آنسو، پیر کے چھالے ، دل کے زخم دکھا
اُس سے کہنا ، کیا کہنا ہے، کیا میری اوقات
کر دے مجھ پہ اپنے پیار کی رِم جھم سی برسات

ابھی وہ لوگ باقی ہیں

مبارک صدیقی

جو اپنے حادثوں کے دکھ چھپائے مسکراتے ہیں
جو بنجر موسموں میں بارشوں کے گیت گاتے ہیں
جو تتلی پھول اور خوشبو کے موسم ساتھ لاتے ہیں
ابھی وہ لوگ باقی ہیں
جو زخمی فاختہ کو گھونسلے تک چھوڑ آتے ہیں
جو بچھڑی کُونج کو پھر ڈار سے واپس ملاتے ہیں
اُسے تنہائیوں میں موت کے دکھ سے بچاتے ہیں
ابھی وہ لوگ باقی ہیں
جو شہرِ بے وفا میں بھی کیا وعدہ نبھاتے ہیں
جو کر کے ہاتھ زخمی راہ سے کانٹے اُٹھاتے ہیں
وہ جن کے ہاتھ میں دیئے دعا کے جھلملاتے ہیں
ابھی وہ لوگ باقی ہیں

جو اپنے نام سے انسانیت کو معتبر کردیں
محبت کی نگاہ ایسی کہ زرے کو گہر کر دیں
جو پتھر کھائیں، دیکھیں مسکرائیں، در گزر کر دیں
ابھی وہ لوگ باقی ہیں

جو اپنی ذات کی پرچھائی سے آگے نکل جائیں
کسی کی آنکھ کے آنسو ستاروں میں بدل جائیں
وہ جن کو دیکھ کے سب درد کے سورج پگھل جائیں
ابھی وہ لوگ باقی ہیں
وہ جن کے اپنے پاؤں میں کئی گرداب ہوتے ہیں
مگر وہ روح کی پاتال تک شاداب ہوتے ہیں
وہ ایسے لوگ جو ہر دور میں نایاب ہوتے ہیں
ابھی وہ لوگ باقی ہیں

نظم ۔ مبارک صدیقی

تینڈھی گل گل پُھل گلاب اے تینڈھا مکھڑا دلنواز
میکوں جد جد تینڈھی یا د آوے میں بھج بھج پڑہاں نماز

تینڈھا حُسن وی مقناطیسی تے مینڈھا عشق وی حدوں پار
میں صدقے تھیواں سوہنیاں تینڈے مکھ توں سو سو وار

تینڈھی سوچاں سوچدے سوچدے انج بھلے میکوں راہ
میں چلیا وَل بازار کُوں تے پجُیا وِچ درگاہ

تُوں ٹوٹا چن دا سوہنٹریاں میں گلی دا رُلدا ککھ
میکوں پچھن والا کائی نئیں تینڈھے حُسن دے عاشق لکھ

تینڈھی جگ مگ ویکھ کے ہک واری تے تارے جان کھلو
خورشید وی لُک لُک ویندا اے تینڈھے مکھ دی جِھل مِل لو

تینڈی گل ہے امرت ایویں جیویں ٹپکے ٹپ ٹپ رس
ہُن سُناں ہزار میں بانسریاں میکوں آندا کائی نئیں چس

میнڈے سامنے بے پروائی نل جد ہس ہس گل کریناں
اس حدوں دوھ نمانے نوں سوؤں رب دی مار سُٹیناں

اے دنیا چوکھی ڈاڈی اے اِتھاں پل پل اے دشوار
ہک دل ہے میнڈھا شیشے دا اُتوں لوک نیں وانگ لوہار

میнڈھے کھوٹے سکے رُل رُل کے ہک روز کھرے ہوویسن
تُوں ملیا میکوں جس دن ، میнڈے بخت ہرے ہوویسن

ہک سِکھی عشق صحیفے چوں میں سو گلاں دی گل
لکھ دنیا پئی تکلیفاں دے رکھ قبلہ یار دے ول
مبارک صدیقی

وہ چہر ہ ایک گلاب سا

وہ سایہ میٹھے بادل کا
وہ چہرہ نور و نور
وہ یار طبیب جو دیکھ کے
ہر دکھ سے کر دے دور
وہ سایہ سبز دعاؤں کا
جو کر دے جاں گلزار
وہ جس کو دیکھ کے اُجڑا دل
ہو جائے برگ و بار
وہ چہرہ ایک گلاب سا
دل مانگے دید ہی دید
وہ صورت ہو جو سامنے
میری ہر دم عید ہی عید

ہم وہی لوگ ہیں
نظم

جنکی گلیوں میں کانٹے بچھائے گئے
جنکے بستے ہوئے گھر جلائے گئے
وہ جو ہر دور میں آزمائے گئے
بے گناہ جو لہو میں نہائے گئے
ہم وہی لوگ ہیں ہم وہی لوگ ہیں

وہ جو رسمیں وفا کی نبھا کے چلے
شہر جاناں کو سب کچھ لُٹا لے چلے
ہر قدم ضبط غم آزما کے چلے
اپنے پیاروں کی لاشیں اُٹھا کے چلے
ہم وہی لوگ ہیں ہم وہی لوگ ہیں

وہ جو قصوں کتابوں میں مشہور تھے
وہ جو حق بات کہنے پہ مامور تھے
وہ جومحصور تھے وہ جو مجبور تھے
وہ جو سقراط تھے وہ جو منصور تھے

ہم وہی لوگ ہیں ہم وہی لوگ ہیں

وہ جنہوں نے جفاؤں کو مانا نہیں
چار دن کے خداؤں کو مانا نہیں
قاتلوں بے وفاؤں کو مانا نہیں
جبر کی انتہاؤں کو مانا نہیں
ہم وہی لوگ ہیں ہم وہی لوگ ہیں

وہ حرفِ وفا معتبر کر گئے
یوں جلے شب نگر میں سحر کر گئے
وہ جو اُجڑے چمن باثمر کر گئے
عشق اپنے لہو سے امر کر گئے
ہم وہی لوگ ہیں ہم وہی لوگ ہیں

سجا کے آنکھوں میں خواب رکھنا

سجا کے آنکھوں میں خواب رکھنا
وفا کے رشتے گلاب رکھنا
فصیل شب میں چراغ بن کے
یہ زندگی ماہتاب رکھنا
سجا کے آنکھوں میں خواب رکھنا

یوں عشق کا امتحان دینا
کہ دل کے بدلے میں جان دینا
جو چاند چھونے کی آرزو ہے
تو جستجو لاجواب رکھنا
سجا کے آنکھوں میں خواب رکھنا

ہزار باتیں بنائے دنیا
ہزار دل کو دکھائے دنیا
بھلا کے ساری اذیتوں کو
اُٹھا کے کانٹے گلاب رکھنا
سجا کے آنکھوں میں خواب رکھنا

کبھی زمانے سے چھپ چھپا کے
سکوت شب میں دیا بجھا کے
ہتھیلیوں کو دعا کی شمع
تو آنکھ اپنی چناب رکھنا
سجا کے آنکھوں میں خواب رکھنا

عداوتیں بھی خدا کی خاطر
محبتیں بھی خدا کی خاطر
عداوتیں بس گنی چنی ہوں
محبتیں بے حساب رکھنا

نظم

میں تھوڑا سا درویش بھی ہوں، میں تھوڑا دنیا دار
مری آنکھ بھلے ہو دشمن پر، مرے دل میں ہر دم یار
وہ یار کہ جس کی ایک جھلک سے من میں چین قرار
وہ یار کہ جس کا پیر پڑے تو دشت بنے گلزار
وہ یار کہ جس کے حُسن کی لو سے دیپک جائیں جل
وہ یار کہ جس کو دیکھ کے دُکھ کے سورج جائیں ڈھل
وہ جس کی جگ مگ دیکھ کے خِیرہ نیلم اور مرجان
وہ جس کی جھل مل دیکھ کے جگنو ششدر اور حیران
وہ جس کو دیکھ کے دل آنگن میں کھلیں دعا کے پھول
وہ جس کے حُسن کو دیکھ کے راہی رستہ جائے بھول
وہ جس کو دیکھ کے آئینے کی آنکھ ہو ایسے دنگ
کہ گم سم دیکھتی رہ جائے وہ نور نہایا رنگ
وہ جس کو دیکھ کے پنچھی بھولیں پت جھڑ کے سب دکھ
وہ یار کہ جس کے آجانے سے ہر موسم ہی سُکھ
وہ جسکی ایک جھلک سے آئے روح میں ایسا چس
کہ دل بولے اب اور نہیں، اب یار یہی ہے بس
اُس سوہنے سچے سُندر سے دلدار کے صدقے جاؤں
جو بولے دل کی دھڑکن میں اُس یار کے صدقے جاؤں

وہ شخص یاد آگیا

یونہی کسی کی بات پہ
کبھی ذرا جو دل دُکھا
تو چشمِ نم کو پونچھتے
وہ شخص یاد آ گیا
وہ مہربان اس قدر
کہ مِل کے جاں نہال ہو
وہ غمگسار اس طرح
کہ پھر نہ کچھ ملال ہو
وہ دل نواز یوں بھی تھا
کہ عرضِ حال مان لے
وہ دل گداز اس طرح
کہ دل کی بات جان لے
دعا دعا سی وہ کرن
کہ فصلِ جاں نکھار دے
وہ لمس اک گلاب سا
کہ ہر تھکن اُتار دے

پھر ایک شب کا واقعہ
کہ جب نہ ہو سکی سحر
جدا ہوئے تو ہم نے بھی
یہ جی کڑا کیا مگر
یونہی کسی کی بات پہ
کبھی ذرا جو دل دُکھا
تو چشمِ نم کو پونچھتے
وہ شخص یاد آ گیا

گلاب لوگ

ہم تھے گلاب لوگ اور تیشہ بدست وہ
نکلے تھے کر کے ظلم کے سب بندوبست وہ
سمجھے تھے کم نگاہ کہ لکھتے ہیں بخت وہ
حاکم تھے اور صاحبانِ تاج و تخت وہ
پھر یوں ہوا کہ کھا گئے سارے شکست وہ
ہم ایک جان ، آج بھی اور لخت لخت وہ

اپنا یہی تھا جرم کہ نظریں ملا کے ہم
نکلے تھے شب کے روبرو سورج اُٹھا کے ہم
اس دل کے تار تار میں قرآں بسا کے ہم
نیزوں کے درمیان بھی سینے سجا کے ہم
موسم لہو لہو تھا مگر مسکرا کے ہم
چلتے تھے کوئے یار کو پلکیں بچھا کے ہم

بیٹھے تھے موڑ موڑ پہ پہرے بٹھا کے وہ
نکلے تھے گام گام سے پرچم اُٹھا کے ہم
چلتے تھے طاق طاق سے شمع بجھا کے وہ
رکھتے تھے بام بام پہ تارے سجا کے ہم

چلتے تھے شاخ شاخ سے جگنو اُڑا کے وہ
رکھتے تھے ڈال ڈال پہ مہتاب لا کے ہم

کرنے چلے تھے روشنی نابودو نست وہ
قاتل تھے اور قاتلوں کے سر پرست وہ
پہنچے تھے اپنے زعم میں افلاک ہفت وہ
ہم اہل دل تھے اور تھے موقع پرست وہ
حاکم تھے اور صاحبان تاج و تخت وہ
پھر یوں ہوا کہ کھا گئے سارے شکست وہ
ہم ایک جان آج بھی اور لخت لخت وہ

وصال یار کو جانا تو ہو کے باوضو جانا
مجسم باادب رہنا سراپا آرزو جانا
نگاہ یار وہ شے ہے جو زرے کو بھی زر کردے
اُٹھائے خاک سے اور شہر بھر میں معتبر کردے
عقیدت کے جلائے دیپ اُسکے روبرو جانا

یہ ممکن ہے کہ رستے میں کہیں پہ ابتلا آئے
کہیں لشکر مخالف ہو کہیں ظالم ہوا آئے
ادھر تیر ستم آئے ادھر سنگ جفا آئے
یہ ممکن ہے کہ رستے میں کہیں پہ کربلا آئے
وہاں ثابت قدم رہنا وہاں سے سرخرو جا نا
وصال یار کو جانا تو ہو کے باوضو جانا
جو عاشق جان دینے کے لئے تیار ہوتا ہے
اُسی کے بخت میں لکھا وصالِ یار ہوتا ہے
جو دانہ خاک میں ملنے کو بھی تیار ہوتا ہے
وہی اک دن گلابوں کی طرح گلزار ہوتا ہے
اگر جانا پڑے دیتے ہوئے دل کا لہو جانا
وصال یار کو جانا تو ہو کے باوضو جانا

نظم

وقت پہلے بھی ہم پہ کڑے آئے تھے
اُن کے جیسے ستم گر بڑے آئے تھے
تب بھی آنسو دمک کر ستارے ہوئے
اب بھی موسم لہو سے نکھر جائیں گے
دن گزرتے ہیں یہ بھی گزر جائیں گے

!

ہاتھ قانون کے اب رہا کچھ نہیں
اور منصف کہ جیسے ہوا کچھ نہیں
شہر دار و رسن میں نیا کچھ نہیں
ہم بھی چلتے ہیں سر پہ کفن باندھ کر
تاک اہلِ جفا کے نشانے بھی ہیں
جان دینے کو لاکھوں دِوانے بھی ہیں

!

کیا بتائیں کہ کیسا سماں ہو گیا
اک چمن جو تھا مثلِ خزاں ہو گیا
موسمِ سُکھ جو تھا رفتگاں ہو گیا
پھر بہاروں کا موسم وہ آیا نہیں
باغباں جب سے اہلِ ہوس ہو گئے

آشیانے تھے جتنے قفس ہو گئے

پھر وہ منظر کہ یونہی سزا وار ہم
بے گناہی کے مجرم گناہ گار ہم
پھر گرفتار ہم پھر سرِ دار ہم
شہر والوں سے ہم کیا شکایت کریں
ہم جو ناحق لہو میں نہائے گئے
با وفا تھے سو ہم آزمائے گئے
!
اُن سے کہنا حقائق چُھپا دینے سے
باثمر ڈالیوں کو کٹا دینے سے
یونہی فصلیں کسی کی جلا دینے سے
بانجھ ہوتی نہیں ہیں زمینیں کبھی
بیج تم بو رہے ہو لہو کے جہاں
دیکھنا سر فروشوں کی فصلیں وہاں

اُن سے کہنا ستم آزماتے رہو
روز قانون مل کر بناتے رہو
لاکھ پھولوں پہ پہرے بٹھاتے رہو

کون خوشبو کو پہنائے گا ہتھکڑی؟

کون رکھے گا صحرا گلستان میں؟

کون ڈالے گا سورج کو زندان میں؟

روشنی کا سفر

جذبہ عشق دل میں جگائے ہوئے
اپنے سینوں میں قرآن بسائے ہوئے
نور ایماں کی مشعل اُٹھائے ہوئے
روح سجدے میں اپنی بچھائے ہوئے
یو نہی جاری رہے بندگی کا سفر
آؤ کرتے رہیں روشنی کا سفر

مقتلِ عشق میں گیت گاتے ہوئے
بیڑیاں پاؤں میں چھن چھناتے ہوئے
زہر پیتے ہوئے تیر کھاتے ہوئے
تختہ دار پر مسکراتے ہوئے
یونہی جاری رہے عاشقی کا سفر
آؤ کرتے رہیں روشنی کا سفر

دیکھتا ہوں میں سورج نکلتے ہوئے
تیرگی روشنی میں بدلتے ہوئے
برف کے قید خانے پگھلتے ہوئے

موسم گل کی خوشبو مچلتے ہوئے
یونہی جاری رہے دلکشی کا سفر
آؤ کرتے رہیں روشنی کا سفر

دن گنے جا چکے ظلمتوں کے سجن
ہو رہا ہے خدا ہم پہ سایہ فگن
جگمگانے لگی اب تو صبح چمن
گیت گانے لگے طائر خوش لحن
یونہی جاری رہے نغمگی کا سفر
آؤ کرتے رہیں روشنی کا سفر

گیت صدق و وفا کے سناتے چلیں
پار ڈوبے ہوؤں کو لگاتے چلیں
آؤ روتے ہوؤں کو ہنساتے چلیں
اپنے حصے کی شمع جلاتے چلیں
یونہی جاری رہے زندگی کا سفر
آؤ کرتے رہیں روشنی کا سفر

اُنکو معلوم کیا

مبارک صدیقی

ہم سے درویش لوگوں کی اوقات پہ
اُن کو ہنسنے کی عادت پڑی ہے تو کیا
ہم بھی صبحِ چمن کے پرستار ہیں
راہ روکے ہوئے شب کھڑی ہے تو کیا

بجھ رہی ہے اگر شہر میں روشنی
دوستو دیپ دل کے جلا کے چلو
سنگ اُٹھائے ہوئے ہے زمانہ تو کیا
سر اُٹھا کے چلو، مسکرا کے چلو

اُنکو معلوم کیا کہ خزاؤں میں بھی
جو گلابوں کی صورت نکھر آئے ہوں
قافلے عشق کے وہ ٹھہرتے نہیں
قتل گاہوں سے بھی جو گزر آئے ہوں

اُن کو معلوم کیا پیار ہو جائے تو

لوگ سُود زیاں کو نہیں دیکھتے
اپنے محبوب کی اک خوشی کے لئے
لوگ پورے جہاں کو نہیں دیکھتے

اُنکو معلوم کیا شہر ظلمات میں
روشنی عام ہونا بڑی بات ہے
عشق کرنا خدا سے تو اپنی جگہ
اِس کا الزام ہو نا بڑی بات ہے

اُنکو معلوم کیا چیز بھا جائے تو
اہل دل اُسکی قیمت نہیں دیکھتے
جن کو منزل پہ محبوب آئے نظر
وہ سفر کی صعوبت نہیں دیکھتے
اُن کو معلوم کیا روشنی کے لئے
دل جلانا بھی اعزاز کی بات ہے
بزمِ جاناں میں آنسو چھپائے ہوئے
بیٹھ جانا بھی اعزاز کی بات ہے
اُنکو معلوم کیا شاخ گر سبز ہو
ایک دن اُسکو اثمار لگ جاتے ہیں

اور لکڑی کی ناؤ میں جڑ جائیں تو
کیل لوہے کے بھی پار لگ جاتے ہیں

دنیا کی عدالت میں سزا وار ہیں سائیں
ہم جرمِ محبت میں گرفتار ہیں سائیں
کچھ وہ بھی جفاؤں میں رعائت نہیں کرتے
کچھ ہم بھی طبیعت کے وضعدار ہیں سائیں

راتوں کی سیاہی کو ضیاء کہہ نہیں سکتے
ہم زہر کی پڑیا کو دوا کہہ نہیں سکتے
ہر موڑ پہ دشمن ہو یہ منظور ہے سائیں
ہم لوگ زمانے کو خدا کہہ نہیں سکتے

دنیا کی جفاؤں پہ جفا ہم نہ کریں گے
یہ اور کہ اب اُن سے مِلا ہم نہ کریں گے
پر بات تمہاری تو سئیں سب سے جدا ہے
تم قتل بھی کر دو تو گِلہ ہم نہ کریں گے
ہم لوگ تو ازلوں سے وفا دار ہیں سائیں
دنیا کی عدالت میں سزا وار ہیں سائیں

اس شہرِ پریشان میں کیا ہو نہیں سکتا
اک شخص مگر دل سے جدا ہو نہیں سکتا
دنیا نے کہا جرم ہے اب پیار، محبت
اور ہم نے کہا فرض قضاء ہو نہیں سکتا

دنیا سے محبت کا فقط یہ ہے خلاصہ
مل جائے جو دریا بھی تو انسان ہے پیاسا
انسان کو آتی ہے سمجھ دیر سے جا کر
نیکی ہی کمائی ہے یہی کُل ہے اثاثہ

دل سے جو نکلتی ہے دعا رد نہیں ہوتی
مولی کے کرشموں کی کوئی حد نہیں ہوتی
ہم ہجر میں بھی وصل کی امید ہیں رکھتے
ویسے بھی محبت کی تو سرحد نہیں ہوتی
ہم لوگ دعاؤں کے طلبگار ہیں سائیں
دنیا کی عدالت میں سزا وار ہیں سائیں

غزل

حمد باری تعالیٰ

اُس ذات کو پایا ہے وفاؤں میں سمندر
وہ ذات، جو ہے اپنی عطاؤں میں سمندر

تم اُس سے کرامت کی توقع نہیں کرتے؟
وہ جس نے اُچھالے ہیں فضاؤں میں سمندر

اک اُس سے کرو ذکر کبھی تشنہ لبی کا
پڑ جائیں گے روتے ہوئے پاؤں میں سمندر

وہ نور ہے وہ نور کہ جگمگ ہوئے سورج
وہ پیڑ ہے، وہ پیڑ کہ چھاؤں میں سمندر

کہتے ہیں کہ ٹپکا تھا کسی آنکھ سے آنسو
آیا تھا جو بپھرا ہوا گاؤں میں سمندر

درپیش تھا دنیا میں مجھے درد کا صحرا
سو یاد رہا دل کو دعاؤں میں سمندر

کیا اُس کی محبت کا تصور ہو مبارک
رکھتا ہے محبت کے جو ماؤں میں سمندر

قطعہ

کس حال میں اک شخص مجھے چھوڑ گیا ہے
برسات ہے آنکھوں میں تو پاؤں میں سمندر

کچھ میں بھی طبیعت کا طلبگارِ وفا تھا
کچھ وہ بھی مزاجاً تھا جفاؤں میں سمندر

کچھ دل کو ہیں آزار ذرا اور طرح کے
کچھ وہ بھی ہیں غمخوار ذرا اور طرح کے

گرداب سے نکلا تھا مگر ڈوب گیا میں
آئے تھے مددگار ذرا اور طرح کے

کچھ حُسنِ مسیحا بھی زمانے سے الگ ہے
کچھ ہم بھی ہیں بیمار ذرا اور طرح کے

دشمن بھی مرے عام نہیں خاص ہیں سارے
اور یار بھی ہیں یار ذرا اور طرح کے

ہم لوگ محبت میں سیاست نہیں کرتے
ہم لوگ ہیں دو چار ذرا اور طرح کے

یوں خواب نہ بیچو کہ یہاں شہرِ جفا میں
بیٹھے ہیں خریدار ذرا اور طرح کے

انصاف تو کہتا تھا کہ قاتل کو سزا ہو
منصف تھے سمجھدار ذرا اور طرح کے

محشر میں ہمیں بخش دیا اُسنے یہ کہہ کر
ہوتے ہیں گناہ گار ذرا اور طرح کے

سنتے ہیں مبارک کو کوئی چوٹ لگی ہے
کہتا ہے وہ اشعار ذرا اور طرح کے

غزل

مانا کہ وہ بھی آج تک مانا تو ہے نہیں
ہم نے بھی اُسکے شہر سے جانا تو ہے نہیں

رکھی ہے کوئے یار کی مٹی سنبھال کے
اس سے بڑا زمیں پہ خزانہ تو ہے نہیں

کچھ لوگ تیرے شہر کے خنجر بدست ہیں
کچھ ہم نے باز عشق سے آنا تو ہے نہیں

کہتے ہیں لوگ اُن سے کہو جاکے حالِ دل
اب ہم نے اپنی جان سے جانا تو ہے نہیں

خانہ بدوش لوگ ہم دنیا کو کیا کریں
دنیا سے لے کے ساتھ کچھ جاناتو ہے نہیں

ک زخم زخم قوم سے درویش نے کہا
تم نے کسی کی بات کو مانا تو ہے نہیں

جرمِ وفا پہ لائے ہیں مقتل میں وہ ہمیں
اب اُن کے پاس اور بہانہ تو ہے نہیں

ملتے ہیں جس خلوص سے ہم ہر کسی کے ساتھ
ویسے یہ اس طرح کا زمانہ تو ہے نہیں

کچھ اس لئے بھی آج تک روٹھے نہیں ہیں ہم
آ کے ہمیں کسی نے منانا تو ہے نہیں

اپنا سنا کے حال اُسے کچھ نہ پوچھنا
اُس کم سخن نے کچھ بھی بتانا تو ہے نہیں

ایک طویل غزل

دعا کی لو سے میں دیئے جلانے والا ہوں
میں کوئے یار میں جاں بھی لٹانے والا ہوں

پھر اس سے کیا کہ مجھے کیا دیا ہے دنیا نے
مرا جو فرض ہے وہ میں نبھانے والا ہوں

یہ پھول اُس نے مجھے بے سبب نہیں بھیجے
میں اُسکی راہ سے کانٹے اُٹھانے والا ہوں

مری نگاہ میں شبنم بھی اک سمندر ہے
اے میرے دوست میں صحرا سے آنے والا ہوں

امیر شہر کے فتووے بجا ہیں لیکن دوست
میں نوکِ دار بھی سچ سچ سنانے والا ہوں

مجھے خبر ہے کمانوں سے تیر چُھوٹے ہیں
مجھے خبر ہے مری جاں میں جانے والا ہوں

مرے قبیلے میں عہد و وفا ہی سب کچھ ہے
سو جان دے کے میں وعدہ نبھانے والا ہوں

میں اُسکی آنکھ کے نشے سے لڑکھڑایا تھا
وہ کہہ رہا تھا، میں پینے پلانے والا ہوں

میں تیرے عشق میں دنیا تو چھوڑ دوں لیکن
میں اپنے گھر میں اکیلا کمانے والا ہوں

تو کیا ہوا جو ترے ہاتھ سے اُڑے جگنو
میں چاند لے کے ترے شہر آنے والا ہوں

کچھ اس لئے بھی زمانے تری مری نہ بنی
تُو دل کا چین، میں آنسو چرانے والا ہوں

میں تیرے ہاتھ کی تحریر کیا کروں کہ تُو
مکر گیا تو میں کس کو دکھانے والا ہوں

تجھے بھی شوق ہے آنکھیں مری چھلک جائیں
مجھے بھی ناز ہے ، میں مسکرانے والا ہوں

نہ پوچھ مجھ سے زمانے وفا کی اُجرت کا
تری طرح میں کوئی دل دُکھانے والا ہوں

یہ اور بات کہ اب اُس کو میری یاد آئی
یہ اور بات میں دنیا سے جانے والا ہوں

غزل

مبارک صدیقی

دامن تہی اُداس تھا، کہتا میں کیا غزل
پلکوں سے ڈھل رہی تھی کوئی جھلملا غزل

میں حرف مانگتا پھرتا تھا اور پھر
اک شخص میرے سامنے تھا سر تا پا غزل

دیکھا اُسے تو مجھ سے بھی خوشبو لپٹ گئی
سوچا اُسے تو نور میں آئی نہا غزل

وہ روشنی تھی چار سُو کہ دل تھا زرق برق
وہ حُسنِ یار تھا کہ گئی جگمگا غزل

جی چاہتا تھا اُس سے کہوں اے گلاب شخص
ہوتی نہیں ہے اب مری تیرے سِوا غزل

اے حُسنِ بے پناہ مجھے چھوڑ کر نہ جا

تُو نہ رہا تو کون سی محفل ہے ،کیا غزل

عاشق ہے وہ جو یار کی چوکھٹ سے نہ اُٹھے
دلبر، جو اک نگاہ سے کر دے عطا غزل

جاتا تھا کوئے یار کو اک شخص باوضو
لکھتا تھا حُسنِ یار پہ کر کے دعا غزل

دشتِ سخن سے آج ہی لوٹا ہوں جاں بلب
جام و سبو کو چھوڑ دے، ساقی سُنا غزل

غزل

مبارک صدیقی

یہ رنگ میرے گلاب کر دو، یہ ہجر میرے وصال کر دو
میں چاہتا ہوں کہ آج مجھ پر نگاہِ لطف و جمال کر دو
میں چاہتا ہوں کہ آج مجھ سے گلاب خوشبو اُدھار مانگے
میں چاہتا ہوں کہ آج مجھ پر عنائتوں کا کمال کر دو
بچھڑ کے تجھ سے میں ہجرتوں کی، غلام گردش میں کھو گیا ہوں
سو اے مسیحا ملو کچھ ایسے کہ دور سارے ملال کر دو
میں چاہتا ہوں بہشت والوں کو مجھ سے ملنے کی آرزُو ہو
میں چاہتا ہوں کہ مجھ سے پتھر کو بھی ستارہ مثال کر دو
میں ہجرتوں کی تمازتوں میں تری جھلک کو ترس گیا ہوں
سو مثلِ بارش برس برس کے، یہ روح میری نہال کر دو
میں اپنے خوابوں کے روز دل سے کئی جنازے اُٹھا رہا ہوں
میں تیرا عاشق، سو میرے عہدے پہ جان مجھ کو بحال کر دو

غم کیا ہے

رضائے یار ہے جب انتہاء تو غم کیا ہے
اگر جدائی تھی اُسکی رضا تو غم کیا ہے

یہ دل یہ جان یہ دیوان سب اُسی کا ہے
جو ایک زخم ہے اُسکی عطاء تو غم کیا ہے

پھر اس سے کیا کہ مقابل ہے کون صف آراء
ہے ساتھ جب اپنے خدا تو غم کیا ہے
ا
بھی ہیں لوگ کچھ سقراط کے قبیلے سے
کماں بدست ہیں اہل جفا تو غم کیا ہے

ہے انکے ساتھ بھی لشکر جفا پرستوں کا
ہے اپنے ساتھ بھی تیری دعا تو غم کیا ہے

انہیں بھی زعم ہے کچھ دشمنی نبھانے کا

ہمیں بھی ناز ہم اہل وفا تو غم کیا ہے
وصال یار کا رستہ ہے قتل گاہوں سے
سو آگیا ہے اگر کربلا تو غم کیا ہے

یہ اور بات ہے یہ لکھ کے ہم بہت روئے
وہ ہو گیا ہے اگر بے وفا تو غم کیا ہے

ـــ

غزل   مبارک صدیقی

جنگ ہے لڑنی ہمیں چنگیزوں، شب زادوں کے ساتھ
رات کے پچھلے پہر سجدوں میں فریادوں کے ساتھ

طائروں کی، آشیانوں کی، خدایا خیر ہو
باغباں دیکھے گئے ہیں پھر سے صیادوں کے ساتھ

وہ اگر تاریخ پڑھ سکتے تو یہ بھی جانتے
جیت جذبوں سے ہوئی ہے نہ کہ تعدادوں کے ساتھ

بالیاں سونے کی اُگتی ہیں وہاں ہر ڈال پر
کھیت جو سینچے گئے ہوں عشق کی کھادوں کے ساتھ

ہم ہیں سادہ دل، مگر ایسے بھی سادہ ہم نہیں
چار دن ہم بھی رہے ہیں اپنے اُستادوں کے ساتھ

چشمِ حیراں، غم زدہ یہ دیکھتی ہے روز و شب
کیا کیا انسان نے، انساں کی اولادوں کے ساتھ

بات کرتے ہیں، ہوا کو، مصلحت کو دیکھ کر
کیا گِلہ کوئی کرے اب ایسے نقادوں کے ساتھ

آوٗ اشکوں سے وضو کر کے اُسے ملنے چلیں
وہ سُنا ہے، پیار سے ملتا ہے بربادوں کے ساتھ

غزل

مبارک صدیقی

دل کسی کے پیار میں سرشار تھا ایسا کہ بس
اور پھر وہ بھی گل و گلزار تھا ایسا کہ بس

ایک تو دل ڈھونڈتا رہتا تھا کوئی غم شناس
اور پھر وہ شخص بھی غمخوار تھا ایسا کہ بس

میں کہ آیا تھا خزاں کے شہر سے اُجڑا ہوا
وہ کہ اک شاداب برگ و بار تھا ایسا کہ بس

ایک تو اُس قافلے میں لوگ تھے مہتاب سے
دوسرے وہ قافلہ سالار تھا ایسا کہ بس

آئینے رکھے ہوں جیسے چاندنی کے شہر میں
سامنے اپنے وہ حُسن ِ یار تھا ایسا کہ بس

پوچھتے ہو دوست کیا احوال وصل ِ یار کا
ایک دریا دشت کے اُس پار تھا ایسا کہ بس

کیا نظارہ تھا مبارک آنکھ جگمگ ہو گئی

روبرو میرے وہ حُسنِ یار تھا ایسا کہ بس

فرض کرو

مبارک صدیقی

دھوپ سہانی اور جھل مِل ہو فرض کرو

ہم دونوں اور اک ساحِل ہو فرض کرو

تم دیکھو اور میں دیکھوں پھر میں دیکھوں

مست ہوا اور پاگل دِل ہو فرض کرو

ایک تو تیرا روپ سنہرا سُندر ہے

اور پھر گال پہ کالا تِل ہو فرض کرو

جنت میں کمخواب سی مخمل راہوں پر

تیری میری اک منزِل ہو فرض کرو

چاند ستارے،پھول دھنک، خوشبو اور تم

رنگ و نور کی اک محفل ہو فرض کرو

کاش کہ نفرت کی سب فصلیں جل جائیں

اُلفت ہو اور دل بہ دل ہو فرض کرو

کاش کہ ہر آنگن میں سُکھ کے پھول ِکھلیں

جس کا خواب ہے جو ،حاصل ہو فرض کرو

خواب مبارک روح کو زندہ رکھتے ہیں

شائد خواب سی اک منزل ہو فرض کرو

غزل

مبارک صدیقی

شہر میں آئے، تو پھر یہ حادثہ ہونا ہی تھا
ایک دن اندر کا انساں، لاپتہ ہونا ہی تھا

شہر والوں نے چُنے حاکم یزیدی قوم سے
اب گلی کُوچوں کا منظر کربلا ہونا ہی تھا

بات چل نکلی تھی خوشبو روشنی اور پھول کی
اب مری محفل میں تیرا تذکرہ ہونا ہی تھا

بے سبب تیری گلی میں تتلیاں جگنو نہیں
جس نے بھی دیکھا تجھے، اُسنے ترا ہونا ہی تھا

لوگ کہتے ہیں کوئی عیسی ہے اُترا آج کل
زخم کہتے ہیں مرے ، یہ معجزہ ہونا ہی تھا

میں نے اُسکی راہ میں رکھے تھے خوشبو کے چراغ
سو مرا اُس گُل بدن سے رابطہ ہوناہی تھا

آج پھر اخبار پڑھ کے چشمِ تر کہنے لگی
آج ہوتی، گر قیامت نے بپا ہونا ہی تھا

آدمی اچھا تھا وہ ، سو تہمتیں اُس پر لگیں
آجکل کے دور میں جیسے ہوا ، ہونا ہی تھا

وہ دعا کرتے ہوئے تھکتا نہ تھا تھکتا نہ تھا
آسماں سے اُس کے حق میں فیصلہ ہونا ہی تھا

کل کوئی لفظِ محبت سن کے دکھ سے رو پڑا
مجھ سے بڑھ کر بھی تو کوئی، دل دُکھا ہونا ہی تھا

وہ بھی دیتا ہے حوالے اب مرے اشعار کے
میں نہ کہتا تھا مبارک ، معجزہ ہونا ہی تھا

غزل مبارک صدیقی

روپ سنہرا، آنکھ کنول ہے ، کیا لکھوں
اُسکی اک اک بات غزل ہے ، کیا لکھوں

میں کہ دکھ کے صحراؤں میں پیاسا ہوں
وہ کہ سُکھ کا ، گنگا جل ہے ، کیا لکھوں

میں کہ ہر ہر موڑ نئے دوراہے پر
وہ کہ ہر اُلجھن کا حل ہے، کیا لکھوں

سوچ رہا تھا ،لکھ دوں ، دِل کی بات اُسے
پھر سوچا ، دِل تو پاگل ہے، کیا لکھوں

جس کو دیکھ کے وقت کی نبضیں رک جائیں
اُس کی آنکھ میں وہ کاجل ہے ، کیا لکھوں
شہر ترے سے نکلا ہوں میں کچھ ایسے
آنکھیں نم ہیں، اور دلدل ہے ، کیا لکھوں
میں بیٹھا تھا، لکھنے، اپنے غم اُس کو
اشکوں سے ،خط ہی جل تھل ہے، کیا لکھوں

رُوپ نگر کا، نور سا جِھل مِل وہ چہرہ
سُندر، شیتل اور کومل ہے، کیا لکھوں

چاند ستارے اُس کو دیکھ کے جلتے ہیں
وہ جگ مگ سا، شیش محل ہے، کیا لکھوں

اُس کے لَمس کو پھول گلاب ترستے ہیں
وہ شاداب ہے، یا مخمل ہے کیا لکھوں

اُس نے قتل کیا، پر کون گواہی دے
ساری دنیا اُس کے "وَل" ہے، کیا لکھوں

ایک مبارک وہ نہ دل سے دور رہے
باقی تو پھر چل سو چل ہے ، کیا لکھوں

غزل

وہ بھی ہجر فسانے دل میں رکھنے والا نئیں
میں بھی قول قرار سے پیچھے ہٹنے والا نئیں

کون ہیں میرے دشمن سجن ، سب کو ہے معلوم
میں پردوں کے پیچھے چُھپ کر مِلنے والا نئیں

رنگ سنہرا، جگمگ آنکھیں، سُندر رُوپ سرُوپ
ایسے قاتِل حملے میں، میں بچنے والا نئیں

جانتا ہوں میں کیوں رہتے ہیں مجھ سے لوگ خفا
میں لوگوں کو جھوٹے سپنے بیچنے والا نئیں

اُس کو بھی دربار میں دیکھا جوڑے دونوں ہاتھ
وہ جو اکثر کہتا تھا میں بِکنے والا نئیں

دنیا زخم لگانے میں ہے تُو بھی پختہ کار
میں بھی تجھ سے پتھر کھا کر، گرنے والا نئیں

اُس سے کہنا، جیتنا ہے ، تو پیار سے مجھ سے جیت
تُو نے خنجر پکڑا تو میں ہارنے والا نئیں

کاش مجھے وہ چاند کہے آ میرے پاس بھی بیٹھے
ویسے جب میں بیٹھ گیا تو اُٹھنے والا نئیں

عشق نگر کے رستے بھی ہیں پتھریلے پُرخار
میں بھی زخمی پیر کے چھالے گننے والا نئیں

میرے قاتل، منصف کیا، تو پورا شہر خرید

کچھ بھی ہو ،میں تیرے حق میں بیٹھنے والا نئیں

اور کسی سے جا کے، جلتے گھر کی قیمت پوچھ

میں بازار میں بیٹھ کے آنسو بیچنے والا نئیں

میں ہو ں عشق قبیلے سے ، دُکھ درد مری میراث

مر جاؤں گا پیار مرا یہ مرنے والا نئیں

مبارک صدیقی

غزل

اوپر سے بارشیں

تنکوں کا سائبان ہے، اوپر سے بارشیں
اِک شہر بے امان ہے، اوپر سے بارشیں

ٹوٹے ہوئے ہیں پر مرے، صیاد سامنے
کھینچے ہوئے کمان ہے، اوپر سے بارشیں

مجھ بے امان شخص کا ، کیا پوچھتے ہو حال
کچا مرا مکان ہے، اوپر سے بارشیں

اس بار ہجرتوں سے عجب فاصلے بڑھے
دریا بھی درمیان ہے، اوپر سے بارشیں

کچھ نورِ حُسنِ یار بھی ہے مثلِ آفتاب
کچھ دل بھی نوجوان ہے، اوپر سے بارشیں

کچھ شام بھی ہے شام سے ہی سوگوار سی
کچھ اُسکا بھی دھیان ہے ، اوپر سے بارشیں

وہ دن گئے کہ عشق میں آتش جوان تھا
اب مستقل تھکان ہے، اوپر سے بارشیں

اک حقیقت اتنے افسانوں کے بیچ
میں ابھی زندہ ہوں زندانوں کے بیچ

اس طرح تنہاء ہوں تیرے شہر میں
جس طرح کافر مسلمانوں کے بیچ

وہ جسے اپنوں سے تھیں خوش فہمیاں
رو پڑا وہ شخص بیگانوں کے بیچ

سانحہ یہ ہے کہ تنہاء رہ گیا
آج کا انسان ، انسانوں کے بیچ

اور کیا اب مانگتے ہو معجزہ
اک دیا روشن ہے طوفانوں کے بیچ

یہ ملا ہے عشق کا یارو صلہ
آج میں بیٹھا ہوں دیوانوں کے بیچ

لگ رہی ہیں بولیاں انسان کی
شہر بھر کی اتنی آذانوں کے بیچ

اور کیا دوں پارسائی کا ثبوت
ہوش میں ہوں عین مے خانوں کے بیچ

اک مبارک وہ مجھے اچھا لگا
رنگ خوشبو اور گلدانوں کے بیچ

غزل

دیکھ کر صورت تری ، یہ دل دھڑک جائے تو کیا

راکھ کے ملبے میں اب شعلہ بھڑک جائے تو کیا

میں ابھی دفنا کے بیٹھا ہوں محبت کے گلاب

اب مرے آنگن پہ بجلی بھی کڑک جائے تو کیا

جس سے ٹُوٹا ہو تعلق عمر بھر کے واسطے

اس کے گھر جانے کو اک سیدھی سڑک جائے تو کیا

ہجر کے پنجرے میں بیٹھا موسمِ گُل سوچ کر

پھر سے گھائل سا کوئی پنچھی پھڑک جائے تو کیا

اک ترے قدموں کی آہٹ سے دھڑکتا تھا یہ دل

اب خزاں موسم میں اک پتہ کھڑک جائے تو کیا

مبارک صدیقی (1999)

آنکھ ہے اشکبار ویسے ہی
دل ہے کچھ بے قرار ویسے ہی
تم نہ آؤ گے جانتا ہے دل
پھر بھی ہے انتظار ویسے ہی
کس مسیحا نے نبض دیکھی ہے
آ گیا ہے قرار ویسے ہی
کوئی الزام ہو ہمیں دے دو
ہم پہ ہیں بے شمار ویسے ہی
ہم بھی دشمن ضرور رکھتے ہیں
ایک دو تین چار ویسے ہی
حال اُس نے بھی یونہی پوچھا تھا
ہم بھی روئے تھے یار ویسے ہی
کوئی تہوار ہے نہ موقع ہے
آ کے مل جاؤ یار ویسے ہی
آؤ کچھ دیر مسکرائیں ہم
دکھ تو ہیں بے شمار ویسے ہی

مبارک صدیقی

وہ میری زندگی میں تھا یہاں وہاں اِدھر اُدھر
سو کر گیا وہ درمیاں سے داستاں اِدھر اُدھر

سُنا ہے وہ بچھڑ کے بھی نہال ہے ، کمال ہے!
مرے لئے تو ہو گئے ہیں دو جہاں اِدھر اُدھر

نئی صدی میں جو ہوا وہ سانحہ عجیب تھا
ملے تھے سب تپاک سے، مگر دھیاں اِدھر اُدھر

میں چشمِ نم، فگار پا، شکستہ دل، دریدہ تن
کھڑا ہوں یوں، کہ خواب ہیں، دھواں دھواں اِدھر اُدھر

میں سبز تھا تو دوستوں کا اک ہجوم ساتھ تھا
جو نہ رہا تو مُڑ گیا وہ کارواں اِدھر اُدھر

لہو لہو سہی مگر، میں بزمِ یار میں تو ہوں

گزر گئے جو راہ میں تھے امتحاں اِ دھر اُدھر

قطعہ

کبھی مرے چمن میں تھی کبھی مرے وطن میں تھی
یہ ڈھونڈتے جو پھر رہے ہیں سب اماں اِ دھر اُدھر

یہ بخت بھی عجیب ہیں کہ مشکلوں سے دو قدم
زمیں ملی تو ہو گیا ہے آسماں اِ دھر اُدھر

غزل۔ سلام صاحب جی

(مبارک صدیقی)

مجھ سے راضی رہے خدا صاحب

کوئی دے دو مجھے دعا صاحب

جرم میرا بھی ،بے گناہی تھا

سو ملی ہے کڑی سزا صاحب

پیاس، نیزے، فراق ،شامِ غم

زندگی ہے یا کربلا صاحب

مانتا ہوں میں ضبطِ غم لیکن

کچھ تو ہوتی ہے انتہاء صاحب

سب مجھے روند کر گزرتے ہیں

تم سے ٹھو کر لگی تو کیا صاحب

میں گداگر نہیں ہوں، لگتا ہوں

بس یہی ہے مری خطا صاحب

اُن کو فرصت نہیں ہے جینے سے

مر رہا ہے کوئی تو کیا صاحب

آنکھ والے تو دیکھ سکتے ہیں

کیا ضروری ہے دوں صدا صاحب

لُٹ گیا میں خدا کی بستی میں

یہ بھی لکھو ناں سانحہ صاحب
کیا کتابوں میں ہی یہ ہوتا ہے؟
یہ جو ہوتا ہے معجزہ صاحب
اس گلی میں تو سب فرشتے ہیں
کب سے انساں ہے لاپتہ صاحب
کون کرتا ہے یاد پت جھڑ کو
بھول جاؤ جو تم، تو کیا صاحب

وصل کی خواہش لئے شام و سحر جلتا رہا
ایک پروانہ تھا میں جو عمر بھر جلتا رہا

جانے کس کی یاد تھی کل رات کے پچھلے پہر
بجھ گئے دیئے مگر میں بے خبر جلتا رہا

جب خزاں آئی تو اُس نے بھی کنارا کر لیا
جس پہ سائے کی طرح بن کے شجر جلتا رہا

ایک چنگاری مرے خوابوں میں آکر کیا گری
میرے سپنوں کا نگر حدِ نظر جلتا رہا

ڈوب کر سورج مرے سینے میں پانی ہو گیا
زخم اُس کی ، بے وفائی کا، مگر جلتا رہا

کاتب تقدیر تجھ سے اک شکایت ہے مجھے
اُس بھری برسات میں کیوں میرا گھر جلتا رہا

آگ تھی دشمن کے گھر تو آگیا سیلاب کیوں
میں تھا جب پیاسا تو کیوں سارا نگر جلتا رہا

اس طرح اک شخص میری زندگی سلگا گیا
ہجرتوں کی دھوپ میں سارا سفر جلتا رہا

مبارک صدیقی

یہ کمال ہے کہ زوال ہے؟ یہ کمال ہے

ترے ہجر میں بھی وصال ہے، یہ کمال ہے

تُو جسے ملے وہ دعا کرے کہ تُو پھر ملے

ترے پاس یہ جو کمال ہے ، یہ کمال ہے

ترے منتظر کئی مہر و ماہ کہ پڑے نگاہ

تجھے پھر بھی میرا خیال ہے ، یہ کمال ہے

ترا حُسن وہ کہ نظر پڑے تو دیا جلے

ترے روپ میں جو جمال ہے ، یہ کمال ہے

ترے بن قرار جو اب نہیں، یہ عجب نہیں

ترے بن جو سانس بحال ہے ،یہ کمال ہے

مرے پاس سے وہ گزر گیا ، میں نکھر گیا

وہ جو رہگزر تھی نہال ہے، یہ کمال ہے

کہا کل مجھے یہ گلاب نے مرے خواب میں

ترا عاشقی میں جو حال ہے، یہ کمال ہے

دس بیس میں مل جاتی ہے بازار سے خوشبو
بہتر ہے مگر آئے جو کردار سے خوشبو

یہ کون گلابوں سا گزرتا ہے گلی سے
چھن چھن کے جو آ جاتی ہے دیوار سے خوشبو

یہ دل تو عقیدت کے گلابوں سے دھلا ہے
اس دل کو تو آتی ہے در یار سے خوشبو

عاشق کے لئے ہجر کا صحرا ہو یا دریا
جس پار ہے محبوب، اُسی پار سے خوشبو

قاتل نے مٹائے ہیں نشاں میرے لہو کے
یہ اور کہ جائے گی نہ تلوار سے خوشبو
تم پیڑ دعاؤں کا سدا سبز ہی رکھنا
آئے گی خزاؤں میں بھی گھر بار سے خوشبو
ممکن ہے کسی روز تمہیں مڑ کے وہ دیکھے
آتی ہے مبارک ترے اشعار سے خوشبو

غزل

خوشبو میں نہائے ہوئے خوابوں کی طرح ہے
وہ شخص ترو تازہ گلابوں کی طرح ہے

دیکھے ہیں بہاروں کی طرح ہم نے بہت لوگ
وہ ہے کہ بہاروں کے شبابوں کی طرح ہے

انگور کا پانی ہی ضروری نہیں ساقی
دلبر کا نظارہ ہی شرابوں کی طرح ہے

پوچھے جو کوئی اہل سخن اسکا تعارف
کہنا وہ صحیفوں میں نصابوں کی طرح ہے

اب چونکہ چناچہ کی ضرورت نہیں باقی
وہ سارے سوالوں کے جوابوں کی طرح ہے

غزل

محبت کے لئے رسوا سر بازار ہو جائے
وہی عاشق ہے جو وقف رضائے یار ہو جائے

یونہی چرچا نہیں اک شخص کے شاداب ہونے کا
اُسے تو دشت بھی دیکھے گُل و گلزار ہوجائے

اُسے ملنے کبھی جاؤ تو عرض حال مشکل ہے
اگرچہ مل کے آؤ تو غزل تیار ہو جائے

اسے شکوہ رہا ہم بات دل کی کہہ نہیں پائے
ہمیں دھڑکا رہا ایسا نہ ہو انکار ہو جائے

مسیحا خوبصورت ہو اگر اُس شخص کے جیسا
میرے جیسا بہانہ کر کے ہی بیمار ہو جائے

اُٹھائے جا نہ اتنی قرض کی خوشیاں زمانے سے
کہ باقی عمر تُو اسکا بقایا دار ہو جاء

مبارک اور بڑھ جاتی ہیں اپنی عید کی خوشیاں

اگر اک چاند جیسے شخص کا دیدار ہو جائے

شاعری کیا ہے

وہ بات جس سے دُکھا ہوا دل قرار پائے ،وہ شاعری ہے
فصیلِ شب میں جو روشنی کے دیئے جلائے،وہ شاعری ہے

وہ جس کو سُن کر اُداس بلبل کی زندگی میں ترنگ جاگے
وہ جس کو پڑھ کر اُجاڑ آنکھوں میں خواب آئے، وہ شاعری ہے

جو کوئے جاناں کو جانے والے قدم قدم پر گلاب رکھے
جو تپتے صحرا میں بارشوں کی نوید لائے، وہ شاعری ہے

دعا کی لو سے گداز ہو کر، قبولیت کا وہ ایک لمحہ
جو اشک بن کر اُداس آنکھوں میں جھلملائے وہ شاعری ہے

جو فرقتوں کی اُداس شب میں نویدِ صبحِ، وصال بخشے
جو ہجرتوں کی عذاب رُت میں بھی مسکرائے وہ شاعری ہے

وہ سبز موسم جو شہرِ دل کے تمام موسم گلاب کر دے
وہ یادِ جاناں جو دل کے آنگن میں جگمگائے وہ شاعری ہے

غزل

تاجر بھی پرانے ہیں، بازار بھی ویسے ہی
منظر بھی نہیں بدلا، کردار بھی ویسے ہی

پھر درد کی بانہوں میں لپٹی ہوئی خبریں ہیں
مخبر بھی وہی چہرے، اخبار بھی ویسے ہی

کچھ اور نہیں بدلا ، بدلا ہے کیلنڈر ہی
دشمن بھی وہی قاتل ، اور یار بھی ویسے ہی
ویسے تو مسیحا بھی آتا ہے تحمل سے
ہو جاتا ہوں میں ویسے ، بیمار بھی ویسے ہی
وہ محفل ِ رنداں تھی، میں ہوش میں کیا کہتا
ساقی بھی نشے میں تھا، مے خوار بھی ویسے ہی
جاوٗں تو کہاں جا وٗں، اُ س پھول سی صورت کا
انکار بھی ویسے ہی ، اقرار بھی ویسے ہی
اس ہجر فسانے کو، چھوڑو نا مبارک جی
خود تم بھی پہیلی ہو، اشعار بھی ویسے ہی

مبارک صدیقی

معلوم اگرچہ ہے کہ موسم یہ کڑا ہے
دل پھر بھی گلابوں کے لئے ضد پہ اڑا ہے

یاد آئے ہیں پھر لوگ مجھے شہر جفا کے
اک تیر ستم یوں بھی میرے دل میں گڑا ہے

وہ جس سے عبادت کی طرح کی تھی محبت
وہ شخص زمانے کے لئے مجھ سے لڑا ہے

میت کو مری دیکھ کے بولا وہ ستم گر
اُٹھ جائے گا پھر سے یہ اداکار بڑا ہے

جس موڑ پہ بدلی تھی ڈگر اُسنے اے قاصد
کہنا کہ اُسی موڑ پہ دیوانہ کھڑا ہے

غزل۔ (مبارک صدیقی 1997)

دنیا کی دل دُکھانے کی عادت نہیں گئی
اپنی بھی مسکرانے کی عادت نہیں گئی

دامن جلا، یہ دل جلا، یہ انگلیاں جلیں
اپنی دیئے جلانے کی عادت نہیں گئی

کچھ وہ غنیمِ جان بھی ہے مستقل مزاج
کچھ میری جاں سے جانے کی عادت نہیں گئی

اُس سے کہو خلوص سے، لُوٹا کرے مجھے
میری فریب کھانے کی عادت نہیں گئی

وہ شہرِ بدنصیب ہے اُس کے مزاج میں
محسن کا گھر جلانے کی عادت نہیں گئی

کچھ روشنی سے اُنکی، عداوت ازل سے ہے
کچھ اپنی جگمگانے کی عادت نہیں گئی

پھونکوں سے آفتاب بجھانے کی جستجو
بچوں سی اس زمانے کی عادت نہیں گئی

گو تلخیءحالات سے پتھرا گیا وہ شخص
اُسکی غزل سنانے کی عادت نہیں گئی

ڈوبتا جا رہا ہے دل میرا
آج پھر چال لڑکھڑائی ہے
میں گیا تھا طبیب سے ملنے
اُس نے تیری کمی بتائی ہے
مبارک صدیقی

میں تھا ہجوم شہر میں تنہا اداس سا
اور لوگ تھے کہ پاؤں تلے روندتے رہے
پھر یوں ہوا کہ مل گیا جس کی تلاش تھی
پھر یوں ہوا کہ لوگ مجھے ڈھونڈتے رہے

میں کیا کرتا، کب تک لڑتا، کب تک سہتا وار
دشمن کے اُس لشکر میں تھے میرے اپنے یار
نم آنکھوں نے ٹوٹے دل نے ڈال دیئے ہتھیار
دھوپ کڑی تھی، شہر بڑا تھا ، لوگ تھے پتھر مار
(مبارک صدیقی)

محبت ہجرتوں میں وصل کا پیغام ہوتی ہے
محبت نیک بختوں کے لئے انعام ہوتی ہے
محبت کو ضرورت ہی نہیں ہے استخاروں کی
یہ جب ہوتی ہے صاحب صورتِ الہام ہوتی ہے

سانحہ یہ ہے شہر میں میرے
اجنبی آس پاس رہتے ہیں
عام سا آدمی نہیں ملتا
سب بڑے خاص خاص رہتے ہیں

طوفاں سے جب ٹکرا گئے پھر آر کیا اور پار کیا
جب چل پڑے تو چل پڑے پھر تیر کیا تلوار کیا
ہم لوگ ہیں اہلِ وفا دل دے دیا تو دے دیا
تم آزما کر دیکھ لو، اک بار کیا سو بار کیا

جانے وہ کون لوگ تھے جو بے وفا ہوئے

ہم نے تو جس سے پیار کیا عمر بھر کیا

شائد نہیں یقین ہے ملتا خدا ہمیں

کرتے اُسے جو پیار تمہیں جس قدر کیا

برکات خلافت

سکون ہے قرار ہے دعاؤں کا حصار ہے
ہمیں بھی اُس سے پیار ہے اُسے بھی ہم سے پیار ہے
اُسی کے دم سے رونقیں اُسی سے یہ بہار ہے
امام وقت کے لئے یہ جان بھی نثار ہے

خدا سے یہ دعا کرو سدا یہ سائباں رہے
سدا بہار کی طرح وفا کا گلستاں رہے
چمن کا باغباں رہے
اُسی۔۔۔
اگر وہ سوگوار ہو تو زندگی محال ہے
اگر وہ مسکرا پڑے تو ہر کوئی نہال ہے
یہ عشق بے مثال ہے
اسی۔۔
یہ جانتے ہیں آپ بھی اسی میں آب و تاب ہے
شجر کے ساتھ جو رہے وہ شاخ کامیاب ہے
وہ سبز ہے گلاب ہے
اُسی۔۔۔۔

نظم

آؤ اُس سے ملیں
جس کو ملنے سے روح جگمگانے لگے
دل دھڑکنے لگے گنگنانے لگے
چشم ویران پھر جھلملانے لگے
اپنے ہاتھوں سے خوشبو سی آنے لگے
آؤ اس سے ملیں

جس کے لہجے میں لذت ہے ایمان کی
جسکی باتوں میں خوشبو ہے آذان کی
جس کا ہر پل ثناء رب رحمان کی
جس کا ہر بول تفسیر قرآن کی
آؤ اُس سے ملیں

جو کہے بس جیو تو خدا کے لئے
ہر عمل ہو خدا کی رضا کے لئے
سید الانبیا مصطفیٰ کے لئے
وقف ہو جائیں سارے دعا کے لئے

آؤ اس سے ملیں

جس کا دست دعا ایک اعجاز ہے
اب زمیں پہ خدا کی جو آواز ہے
جس کا دھیما سا اپنا ہی انداز ہے
جس کو ملنا سعادت ہے اعزاز ہے
آؤ اس سے ملیں

جس کی نسبت سے ہم معتبر ہو گئے
ہم سے پتھر بھی لعل و گہر ہو گئے
بے ہنر با سخن باہنر ہوگئے
کتنے اُجڑے ہوئے باثمر ہو گئے
آؤ اُس سے ملیں

گو کہ عاشق ہزاروں کھڑے ہیں ادھر
چشم تر ہم بھی جائیں گے اُس رہگزر
ہم خطا کار ہیں جانتے ہیں مگر
اُس کی پڑ جائے ہم پہ بھی شائد نظر
گزرے ہوئے سو سال کی تاریخ گواہ ہے

مبارک صدیقی

گزرے ہوئے سو سال کی تاریخ گواہ ہے
سائے کی طرح سایہ فگن ہم پہ خدا ہے
اور رات جو آئے بھی تو پروانوں کو غم کیا
جلتا ہوا پُرنور خلافت کا دیا ہے

قانون بنائے ہیں بہت اہل ِ ستم نے
اب لے نہ کوئی اُن کے سوا نام خدا کا
ان سادہ مزاجوں سے کوئی جا کے یہ پوچھے
بندے بھی کبھی روک سکے کام خدا کا
ساتھ اپنے محمد کی ، مسیحا کی دعا ہے
گزرے ہوئے سو سال کی تاریخ گواہ ہے

سجدوں میں لُٹا دیتے ہیں اشکوں کے نگینے
دنیا کے خداؤں سے شکائت نہیں کرتے
کچھ اور بڑھا دیتے ہیں لو اپنے لہو میں
ہم تیز ہواؤں سے شکائت نہیں کرتے
کردار کی عظمت کو سدا اونچا کیا ہے گزرے

ہوئے سو سا ل کی تاریخ گواہ ہے

آتی ہے صدا روز شہیدوں کے لہو سے
یہ دیپ ہواؤں سے بجھائے نہ بجھیں گے
قسمت کا لکھا پڑھ نہیں سکتے ہو تو سُن لو
اِک دیپ بجھاؤ گے تو سو اور جلیں گے
مانے نہ کوئی مانے مگر ایسا ہوا ہے
گزرے ہوئے سو سال کی تاریخ گواہ ہے

زندان میں بیٹھا ہوا قیدی کوئی بولا
تسلیم مجھے ہے کہ مرا جرم وفا ہے
ہاتھوں پہ مرے زخم جو تم دیکھ رہے ہو
ٹُوٹے ہوئے شیشوں کو اُٹھانے کی سزا ہے
یہ جرم اگر ہے تو سر عام کیا ہے
گزرے ہوئے سو سال کی تاریخ گواہ ہے

جو لوگ جلا دیتے ہیں اوروں کا نشیمن
وہ لوگ کبھی چین سے سویا نہیں کرتے
اور جن کا نگہبان ہمیشہ سے خدا ہو

گرداب، سفینے وہ ڈبویا نہیں کرتے
طوفان بھی کہتے ہیں کہ ایسا ہی ہوا ہے
گزرے ہوئے سو سال کی تاریخ گواہ ہے

کچھ اسلئے ہجرت بھی ضروری تھی ہماری
اُس شہر ستم گر میں جفا کار بہت تھے
کچھ اُنکو بھی نفرت سے عقیدت تھی زیادہ
کچھ ہم بھی محبت کے پرستار بہت تھے
پہلے سے کہیں بڑھ کے ہمیں اُس نے دیا ہے
گزرے ہوئے سو سال کی تاریخ گواہ ہے
برکت ہے خلافت کی کہ اک ہاتھ پہ یارو
لاکھوں ہیں کروڑوں ہیں جو اک جان ہوئے ہیں
طوفان کی مرضی تھی اُجڑ جائیں یہ لیکن
بُوٹے جو لگائے تھے گلستان ہوئے ہیں
سب اُسکی عطا اُسکی عطا اُسکی عطا ہے
گزرے ہوئے سو سال کی تاریخ گواہ ہے

نظم

ستم گروں نے کہا مل کے یہ عدالت میں
کہ ہم ہیں قادرِ مطلق جزا سزا ہم ہیں
ہمارے ہاتھ میں قسمت ہے اب زمانے کی
ہمارے ساتھ ہے لشکر سو اب خدا ہم ہیں

سُنو یہ فیصلہ اس مقتدر عدالت کا
کہ تم جو شہر میں خوشبو لگائے پھرتے ہو
شبِ سیاہ کے دستور سے بغاوت ہے
یہ تم چراغ جو ہر سُو جلائے پھرتے ہو

یہ مشورہ ہے تمہیں سب چراغ گل کر دو
نہیں تو پاؤں کے نیچے تمہیں مسل دیں گے
تمہاری آنکھ میں تارے جو اب چمکتے ہیں
انہیں نکال کے اشکوں سے ہم بدل دیں گے

ہمارے حکم کے آگے نہ سر جھکایا تو
جو عمر باقی ہے زندان میں گزارو گے
سسک سسک کے جیو گے گداگروں کی طرح

مدد مدد کے لئے ہر طرف پکارو گے

سُنا جو فیصلہ ہم نے تو مسکرائے بہت
کہا جواب میں اُن سے کہ تم یہ بھول گئے
کہ ہم وہ لوگ جو مقتل میں سر اُٹھا کے چلے
لہو کی آنچ پہ دل کا دیا جلا کے چلے

ہمیں بتاؤ گے زندان کی اذیت تم
مگر کروڑ ہا زنداں کہاں سے لاؤ گے
تم اپنی آگ میں خود آخری دموں پر ہو
تم اپنی پھونک سے سورج کو کیا بجھاؤ گے

تمہارے ہاتھ میں مذہب بھی اک کھلونا ہے
سو ہر دکان پہ تم نے خدا کو بیچ دیا
تمہیں نے تخت پہ اپنی گرفت رکھنے کو
ہر ایک دور میں ہر کربلا کو بیچ دیا
تمہیں غرور ہے بارود کے زخیروں پر
ہمیں یقین ہے ہم پیار کے سمندر ہیں
تمہیں گھمنڈ ہے دنیا کی مال و دولت پر

تو ہم بھی عشق کی جاگیر کے سکندر ہیں

وفا کی راہ میں جو آج ہم نے پائے ہیں
یہ دن یہ رات یہ خیرات میں نہیں ملتے
ہزار کشت اُٹھاتے ہیں بیج مٹی میں
چمن کو پھول یوں سوغات میں نہیں ملتے

پلٹ کے دیکھ لو پچھلی صدی کو ایک نظر
جنوں پہ جبر سے کیا انقلاب آئے ہیں
جہاں جہاں پہ کلی اک شہید کی تم نے
وہیں وہیں پہ نکھر کے گلاب آئے ہیں

کبھی یہ بھول نہ جانا یہ باادب سے لوگ
جو مسکرا کے شبِ غم گزار سکتے ہیں
امامِ وقت کے چہرے پہ جو ملال آئے
تو اپنی جان یہ صدقے اُتار سکتے ہیں

کبھی یہ بھول نہ جانا یہ بے ضرر سے لوگ
جو سر جھکائے ہوئے سر کٹا بھی سکتے ہیں
امامِ وقت کے ابرو کے اک اشارے پر
تمہارے زعم کے پرزے اُڑا بھی سکتے ہیں

تم اپنے پاس ہی رکھو یہ فیصلے اپنے
ہمیں یقین ہے اوپر بھی اک عدالت ہے
اُسی کے فیصلے چلتے ہیں اور چلتے ہیں
ازل سے لوح پہ لکھی ہوئی عبارت ہے

غزل

سو خطائیں ایک دن میں در گزر کرتا ہے وہ
پیار سب سے اور ہم سے خاص کر کرتا ہے وہ

اُس کے ہاتھوں میں کوئی پارس کا پتھر ہے ضرور
جو اُسے چھو لے اُسے لعل و گہر کرتا ہے وہ

بھیجتا ہے وہ مجھے خط میں دعاؤں کے گلاب
اس طرح خوشبو کو میرا ہم سفر کرتا ہے وہ

میں تو میرے دوست اک سورج مکھی کا پھول ہوں
پھیرتا ہوں رُخ میں اپنا رُخ جدھر کرتا ہے وہ

آج یہ وعدہ رہا میرِ سپاہ کے روبرو
اک اشارے پہ ہے قرباں جان و مال و آبرو
اے کہ حُسنِ باوضو
رائیگاں جانے نہ دیں گے ہم شہیدوں کا لہو
آج یہ وعدہ رہا میرِ سپاہ کے روبرو
اک اشارے پہ ہے قرباں جان و مال و آبرو

ہم سدا رکھیں گے اونچا پرچم اسلام کو
اور بھی روشن کریں گے مصطفیٰ کے نام کو
صف بہ صف اور کوبہ کو
لاکھ مقتل ہوں، رہیں گے ہم ہمیشہ سرخرو
آج یہ وعدہ رہا میرِ سپاہ کے روبرو
اک اشارے پہ ہے قرباں جان و مال و آبرو

ہم چلے کانٹوں پہ لیکن ہم نے بانٹے ہیں گلاب
جگمگائے ہیں فصیلِ شب میں مثلِ آفتاب
اے کہ جان ِ آرزو

فیصلہ دل سے کیا ہے کر کے دل سے گفتگو
آج یہ وعدہ رہا میرِ سپاہ کے روبرو
اک اشارے پہ ہے قرباں جان و مال و آبرو

ہم امیرِ کارواں کی اقتداء میں ایک ہیں
ہر قدم، ہر امتحاں، ہر ابتلاء میں ایک ہیں
ایک ہیں ہم ہو بہو
توڑ آئے ہیں بہت پیچھے بُتانِ من و تُو
آج یہ وعدہ رہا میرِ سپاہ کے روبرو
اک اشارے پہ ہے قرباں جان و مال و آبرو

جانتے ہیں راہ میں کہسار ہیں طوفان ہیں
ہر قدم پہ بیڑیاں ہیں طوق ہیں زندان ہیں
فصلِ گل مانگے لہو
منزلیں اُس کے لئے ہیں جو کرے گا جستجو
آج یہ وعدہ رہا میرِ سپاہ کے روبرو

ترانہ خدام

سیدی سیدی سیدی سیدی
ہم مجاہد ترے ہم ترے لشکری
سیدی سیدی سیدی سیدی
ہم مجاہد ترے ہم ترے لشکری

اک اشارے پہ یہ جان قربان ہے
اک نہیں تجھ پہ سو جان قربان ہے
ہم کریں گے ہمیشہ اطاعت تری

آسماں جو چھوئیں ہم وہ شہباز ہیں
ہم وہ خدام ہیں ہم وہ جاں باز ہیں
جان قربان ہے اک نگاہ پہ تری
سیدی سیدی سیدی سیدی
ہم مجاہد ترے ہم ترے لشکری

منزلوں کو چلے ہیں تو پھر خار کیا
تیر تلوار کیا تختہ دار کیا
ہم نے باندھے ہیں سر پہ کفن ہر گھڑی

ہم محبت کی شمعیں جلا جائیں گے
نفرتوں کے نشاں بھی مٹا جائیں گے
چار سُو ہوں گے بس احمدی احمدی
سیدی سیدی سیدی سیدی

ہجرت ۔ مبارک صدیقی

کی دسّاں میرے بیلیا کیوں آ بیٹھے پردیس

ساڈے پچھے پُلساں شہر دِیاں ساڈے اُتے ترِن سو کیس

ساڈے وسدے ویڑے ساڑ کے ساڈے گھر نوں لا کے اگ

او جِت گئے کیس عدالت وِچ اوناں اُچی کر لئی پگ

سانوں پئیاں جد جد پیشیاں اساں رکھیا رب وکیل

فِر ہتھ ساڈے ہتھ کڑیاں سن، تے پِنڈا نیل و نیل

ساڈے ہسّن تے پابندیاں ،ساڈے بولن تے تعزیر

ساڈے سجے کھبے سُولیاں ، ساڈے پیراں وچ زنجیر

اساں چلے تپتّے کنڈیاں تے، پر ونڈے پُھل گلاب

پر شہر دے لیکھے لِکھے سن ،کوئی اِک سو اِک عذاب

اساں روز جنازے پڑھدے رہئے ، پر کدے نہ پایا وین

اوس شہر دے اندر بیٹھی سی کوئی سپو ل زہری ڈین

ساڈے پُتر ہوئے لہوا لہو تے سجن لگ گئے بھا

ساڈے ٹُٹ گئے مان محبتاں دے ساڈے لتھ گئے سارے چا

فِر ہنجو کملے پونج کے، تے چُک مصلّا کھیس

سُن میرے سجن بیلیا ، اساں آ بیٹھے پردیس

اسی کتھے آبیٹھے آں
دل کردا سی یورپ جاییٔے
ہیٹ تے کالی عینک پاییٔے
پیٹر رابرٹ یار بناییٔے
پیزے برگر ڈونر کھاییٔے
ایتھے جان پھسا بیٹھے آں
اسی
گڈی ٹھیک کران سی جانا
پنج چھ بل چکان سی جانا
کم تے شکل دکھان سی جانا
پیسے چار کمان سی جانا
سٹھ دی ٹکٹ لوا بیٹھے آں
اسی کتھے
پنجرے دے وچ پھڑک گیٔے آں
ٹیکسی کر کر کھڑک گیٔے آں
پائلٹ بنن دا شوق سی لیکن
ہرتھاں سڑکوں سڑک گیٔے آں
سارے جوڑ ہلا بیٹھے آں

اسی

رعب ذرا وی پا نئیں سکدے
بچیاں نوں دو لا نئیں سکدے
اتھے کن پھڑا نئیں سکدے
بیگم نوں دھمکا نئیں سکدے
مچھ نیوں کروا بیٹھے آں

اسی

ایم او ٹی کروان دے رولے
کونسل ٹیکس چکان دے رولے
گھر دیاں قسطاں لان دے رولے
اُتوں پاکستان دے رولے
سوچاں نل چکرا بیٹھے آں
اسی کتھے آ۔۔

خط اے اینیں سُٹ جاندے نیں
پڑھ کے دل ای ٹٹ جاندے نیں
گورے ہس کے لُٹ جاندے نیں
کالے ایویں ای کٹ جاندے نیں
لگدا اے پنگا ای پا بیٹھے آں

اسی۔۔

ہن تے گاں نوں دل نئیں دل نئیں کردا
پیزے کھان نوں دل نئیں کردا
ہور تے سب کج دل کردا اے
کم تے جان نوں دل نئیں کردا
دل نوں لکھ سمجھا بیٹھے آں
اسی۔۔۔

سجرے پھل تے کلیاں ہوون
آپنے پنڈ دیاں گلیاں ہوون
لسی ساگ تے چھلیاں ہوون
اصلی کھوئے دیاں ڈلیاں ہوون
برگر توں اکتا بیٹھے آں
اسی

ایتھے بوڑھ دی چھاں نئیں لبھدی
پنڈ جئی سچی تھاں نئیں لبھدی
مدت بعد وطن جے جائیے
کئیاں نوں فیر ماں نئیں لبھدی
دو تھاں پیچے پا بیٹھے آں
اسی

پچھلے سال بہانہ لا کے
اک پردیسی دیس نوں جا کے
کلیاں بھہ اک قبر سرہانے
رویا مٹی سینے لا کے
ہیرے لوک گوا بیٹھے آں
اسی کتھے آ۔۔۔

. . . .

”رہئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو“

بل کوئی آتا نہ ہو مالک مکاں کوئی نہ ہو

شعر سننے کے لئے بے تاب ہو محفل بڑی

اور بس میرے سوا شاعر وہاں کوئی نہ ہو

کرسیوں سے باندھ کے رکھے ہوں سارے سامعین

اُٹھ کے جانے کا وہاں وہم و گماں کوئی نہ ہو

داد وہ دیتے رہیں وقفے سے مجھ کو بار بار

چاہے شعروں کی طرف اُنکا دھیاں کوئی نہ ہو

بعد اُس محفل کے کھانا پیش ہو گرما گرم

اور میرے اور اُسکے درمیاں کوئی نہ ہو

آؤ مل کے ہم بنائیں شہر اک ایسا جہاں

نفرتوں کا دور تک نام و نشاں کوئی نہ ہو

پہلے سے معلوم تھا یہ تو ساری دنیا کو
دور فضاء میں اُڑنے والے طائر ہوتے ہیں
لیکن اب معلوم ہوا ہے سائنسدانوں کو
اچھی صورت والے اکثر شاعر ہوتے ہیں

فیس بک اور وائبر پہ مصروف ہیں بچے زیادہ
انٹرنیٹ نے کر ڈالا ہے ہم کو آدھا آدھا
پہلے اُن کے ہاتھ میں تسبیح ہوتی تھی اور اب
وٹس اپ پہ ہے دادی اپنی ٹوئٹر پہ ہے دادا

بن ترے دھندلا گئے منظر تمام
اور ہے ہر چیز سونی ہوگئی
خوبصورت پر کشش نازک بدن
اے میری عینک کہاں تو کھو گئی

کہہ رہا تھا کوئی شکستہ دل
کوئی صورت نظر نہیں آتی
بیٹھتا ہوں میں سب سے آگے بھی
میری فوٹو مگر نہیں آتی

ـــــــــــــــــــــــــــــــــ

دور آیا ہے کمپیوٹر کا
کام اس پہ تمام ہوتے ہیں
اور تو اور آج کل صاحب
مولوی ڈاٹ کام ہوتے ہیں

یہ بھی سڑکیں ہیں کوئی یورپ کی
وقت گویا ہوا میں کٹتا ہے
ان سے اچھی ہے اپنی جی ٹی روڈ
وقت ذکر خدا میں کٹتا ہے

چل نہیں سکتی تھیں جو بیمار تھیں کچھ اسقدر
اُٹھ کے بھاگیں اس طرح گویا اولمپک کھیل ہے
ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا آپ لیٹی ہیں ادھر
آج تو بازار میں کپڑوں پہ لگی سیل ہے

کر کے اغواء ساس میرے باس کی
دی ہے دھمکی ڈاکوؤں نے باس کو
تم نے پہنچائے اگر نہ پانچ لاکھ
چھوڑ دیں گے ہم تمہاری ساس کو

آپ بھی بیگم کی باتوں سے پریشاں ہیں اگر
ایک ہے ترکیب میرے پاس اس جنجال کی
آج جا کے آپ بھی بیگم سے بس اتنا کہیں
آپ جب خاموش ہوں لگتی ہیں سولہ سال کی

میں ساحلوں پہ رہوں پھر بھی مجھ کو پیاس رہے
یہ بد دعا تھی تیری کوئی نہ میرے پاس رہے
مگر میں دیتا ہوں تجھ کو دعا تہہ دل سے
خدا کرے کہ ترے گھر میں تیری ساس رہے

فقط اک شعر تھا میں نے سنایا ساس کے بارے
غلط فہمی ہوئی ایسی کہ اب میری کلاسیں ہوں
مجھے تو ساس کے رشتے سے خود اتنی عقیدت ہے
میری ذاتی تمنا ہے میری دو تین ساسیں ہوں

شیشے کو دیکھ کر تو میں بیگانہ ہو گیا
خود اپنا حسن دیکھ کر دیوانہ ہو گیا
قومی مقابلہ حسن میں میں بھی گیا مگر
اوروں کو ملے کپ مجھے جرمانہ ہو گیا

جنگ بندی کی وہ نہیں قائل
جنگجو اور سخت جان ہے دوست
امن کی پیشکش بھی ٹھکرا دی
تیری بیگم تو طالبان ہے دوست

کنوارہ تھا تو یوں لگتا تھا جیسے
شہنشاہ سکندر آرہا ہے
ہوئی شادی تو اب لگتا ہے ایسے
کوئی پہنچا قلندر آرہا ہے

بیٹھے تھے خوش لباس سے سارے معززین
صبرو رضا پہ بات چلی بات کھل گئی
اُس دعوت ولیمہ میں پھر یک بیک اے دوست
کھانا کھلا تو ساتھ ہی اوقات کھل گئی

سب آکے مجھ سے حال مرا پوچھنے لگے
میں دیکھ کر یہ پیار پریشان ہو گیا
پھر یک بیک وہ دوڑ گئے چھوڑ کر مجھے
آواز آئی وائی فائی آن ہو گیا

خواتین کے شوقین سب سے الگ
یہ کھاتی ہیں سردی میں بھی قلفیاں
جنازے پہ بھی یہ گئی ہوں اگر
وہاں سے بھی بھیجیں گی یہ سیلفیاں

دنیا دے وچ غم نئی مکدے
بندہ مک جائے کم نئی مکدے
سردی گرمی لنگ جاندی اے
یاداں دے موسم نئی مکدے
اسی چن تے کی جاناں اے
ساڈے گھر دے کم نئیں مکدے

لوکاں دی ٹینشن نئی لینی
نقصاناں دا غم نئیں کرنا
ایوئیں سوچاں سوچ سوچ کے
دل نوں ایٹم بم نئیں کرناں
آپنا اک اصول اے یارو
کچھ وی ہو جئے کم نئیں کرنا